Volume 02, Issue 03,
October-December 2024
PP: 131-143
Open Access on:
www.alimanjournal.com

AL-IMAN Research Journal
P-ISSN: 3006-1261 E-ISSN: 3006-127X

اردو فکشن میں ہم جنسیت کے موضوعات کی پیشکش

Presentation of Homosexuality Themes in Urdu Fiction

Dr. Shahid Hussain[1] Muhammad Saleem Akhtar[2]
Muhammad Shahbaz Arshad[3]

Article History

Received
17-11-2024

Accepted
04-12-2024

Published
07-12-2024

Abstract & Indexing

Abstract

This research paper examines the "Representation of Homosexuality Themes in Urdu Fiction," focusing on how LGBTQ+ issues are portrayed in Urdu literary works. Employing a qualitative research methodology, the study critically analyzes selected Urdu fiction texts to uncover recurring themes and patterns related to homosexuality. Through an in-depth content analysis and contextual exploration of cultural and societal dynamics, the paper investigates how authors depict homosexual characters, their narratives, and the challenges they face. The research highlights the intersection of literature, cultural norms, and societal attitudes, shedding light on the complexities of LGBTQ+ representation within the traditional yet evolving landscape of Urdu fiction. It explores whether these portrayals reinforce stereotypes, challenge prejudices, or advocate for broader acceptance of sexual diversity. By addressing these dimensions, the study underscores the role of literature as both a reflection of societal values and a medium for social change.

This paper contributes to the ongoing discourse on inclusivity in literature by offering valuable insights into the treatment of marginalized identities within Urdu fiction. It calls for more empathetic and nuanced storytelling that represents the diversity of human experiences, ultimately advocating for greater acceptance and understanding of LGBTQ+ communities in literary and cultural narratives.

Keywords

Homosexuality, LGBTQ+, Sexual Diversity, Gender, Race, Class, Urdu Fiction, Cultural Attitudes, Societal Norms, Strategies-

[1]***Lecturer, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur.***
shahidhussain@iub.edu.pk
[2] ***Research Scholar, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur.***
mistersaleemakhtar@gmail.com
[3] ***Research Scholar, Department of Urdu, The Islamia University of Bahawalpur.***
iubshahbaz@gmail.com

All Rights Reserved © 2023 This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

HIRA INSTITUTE of Social Sciences Research & Development
OPEN ACCESS

ادب میں اردو ادب اور اردو ادب میں اردو فکشن اپنے موضوعات میں رنگا رنگی اور تنوع سے مالا مال ہے۔ ادب جہاں سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے وہاں ان پر اثر انداز ہونے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ اردو فکشن میں جہاں بہت سے موضوعات پر کھلم کھلا بحث ہوتی ہے وہاں چند ایک موضوعات ایسے ہیں جن پر لکھنے والے اور نقاد ہاتھ کھینچ رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ اردو معاشرے میں مذہب اور عقائد سے ان موضوعات کا متصادم ہونا ہے۔ ایسے میں ان موضوعات پر قلم فرسائی کرنا گویا معاشرے کے طعنے تشنوں کا رخ اپنی طرف کرنے کے مترادف ہے۔ اردو ادب میں ایسا ہی ایک موضوع ہم جنس پرستی ہے۔ یہ مقالہ اردو ادب میں ہم جنس پرستی کے موضوعات کی پیش کش کا احاطہ کرے گا۔ جس کا مقصد یہ جاننا ہے کہ ثقافتی تناظر میں ان موضوعات کو کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔

LGBT (lesbian, gay, bisexual, and transgender) عنوانات کی ممنوعہ نوعیت کے پیش نظر، یہ تحقیق اس بات کو گہرائی سے سمجھنے کی کوشش کرے گی کہ اردو ادب ہم جنسیت پرستی کے متنوع موضوعات کی نمائندگی کیسے کرتا ہے۔

ہم جنسیت کو انگریزی میں "Homosexuality" کا نام دیا جاتا ہے جو دو الفاظ "Homo" اور "Sexuality" کا مرکب ہے۔ ہم جنسیت کی وضاحت ویکی پیڈیا پر کچھ اس طرح ملتی ہے:

> "ہم جنسیت ایک ہی جنس یا جنس کے ارکان کے درمیان رومانوی کشش، جنسی کشش یا جنسی رویہ ہے۔ ایک جنسی رجحان کے طور پر، ہم جنسیت خاص طور پر ایک ہی جنس کے لوگوں کے لیے جذباتی، رومانوی اور جنسی کشش کا ایک پائیدار نمونہ ہے"
>
> "Homosexuality is romantic attraction, sexual attraction, or sexual behavior between members of the same sex or gender. As a sexual orientation, homosexuality is "an enduring pattern of emotional, romantic, and/or sexual attractions" exclusively to people of the same sex."[1]

لہٰذا جدید معاشرے میں جب دو مرد آپس میں جنسی تعلقات قائم کر لیں تو انہیں "Gay" اور اگر دو عورتیں آپس میں جنسی تعلق قائم کر لیں تو انہیں "Lesbian" کا نام دیا جاتا ہے۔ ان الفاظ کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں انہیں مختلف ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ لیکن ہم جنسیت کوئی نیا موضوع نہیں ہے، اس کی تاریخ پہ نظر ڈالیں تو مذہبِ اسلام سے بھی بہت پہلے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم سے اس کے حوالے ملتے ہیں جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی واشگاف انداز میں موجود ہے۔

اسی طرح جب یورپی فاتحین سولہویں اور سترہویں صدی میں شمالی امریکہ میں آکر آباد ہوئے تو وہ اپنے ساتھ ہم جنس پرستی کے نظریات بھی لے کر آئے۔ ہم جنسیت کی ابتداء کے بارے میں خالد سہیل لکھتے ہیں کہ:

> "کاربیز اڈی واکا (Carbeza De Vaca) نے 1528ء-36 میں اُن مردوں کے بارے میں لکھا ہے جنہوں نے ایک دوسرے سے شادی کر رکھی تھی۔ ٹارقیومیڈا (Torquemada) نے 1609ء میں فلوریڈا میں اُن مردوں کا ذکر کیا ہے جو عورتوں کا لباس پہنتے تھے اور دوسرے مردوں سے شادی کرتے تھے۔"[2]

اوائل میں ہم جنسیت کو مغرب میں بھی گناہ کبیرہ سمجھا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس سے متعلق نظریات بدلتے گئے، یوں اس عمل کو قانونی طور پر درست تسلیم کر لیا گیا۔ مشرقی معاشرے میں اس عمل کو شروع سے لے کر اب تک غیر قانونی اور غیر شرعی مانا جاتا ہے جس کے مرتکب افراد کو سزا دینے کے قوانین اور کوڑوں کی صورت میں سزائیں رائج ہیں۔ جنسی رجحان کی صحیح وجہ معلوم نہیں ہے، لیکن یہ مانا جاتا ہے کہ یہ رجحان جینیاتی، ہارمونل اور ماحولیاتی اثرات کے پیچیدہ تعامل کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کوئی ایک جین کسی شخص کے جنسی رجحان کا تعین نہیں کرتا

بلکہ جینیات ماحول کے ساتھ جنسیت کی تشکیل میں کردار ادا کرتے ہیں۔ ہم جنس پرستی کی حیاتیاتی بنیاد کو جینیاتی، ہارمونل اور نیوروبائیولوجیکل عوامل پر غور کرتے ہوئے کریدا جاسکتا ہے جو جنسی رجحان کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

ہم جنس پرستی کے بارے میں رویہ، رجحان یا سوچ دنیا بھر میں مختلف ہے، اس کا انحصار خطے، مذہب، ممالک اور معاشروں کی معاشی ترقی پر ہوتا ہے۔ عام طور پر، شمالی امریکہ، یورپی یونین اور لاطینی امریکہ کے زیادہ تر حصوں میں ہم جنس پرستی کو وسیع پیمانے پر قبول کیا جاچکا ہے، لیکن زیادہ تر مسلم ممالک، صحارا افریقہ، روس اور ایشیا کے اکثر حصوں میں اسے مسترد کیا جاتا ہے، لیکن پھر بھی سابقہ چند دہائیوں میں بہت سی اقوام میں، خاص طور پر نوجوان بالغوں میں ہم جنس پرستی کی قبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مذہب اور ہم جنس پرستی کے درمیان تعلقات مختلف مذاہب اور فرقوں کے اندر مختلف ہیں۔ کچھ مذاہب نے تاریخی طور پر LGBTQ لوگوں کے ساتھ سخت رویہ اپنایا ہے، لیکن تقریباً ہر مذہبی فرقے کے اندر اب ایسے حمایتی گروپس موجود ہیں جنہوں نے LGBTQ لوگوں کے بارے میں مختلف تشریحات اپنائی ہیں۔ کہیں ہم جنس شادی کو قانونی حیثیت حاصل ہے تو کہیں ہم جنس پرستی پر سزائے موت تک شامل ہے۔ جون 2023ء تک، 36 ممالک میں ہم جنس شادی کو تسلیم کیا جاچکا ہے، جبکہ دو ممالک (ایران اور افغانستان) ہم جنس پرستی ایسے جنسی فعل پر سزائے موت تک نافذ کرتے ہیں۔

ادب نے ہمیشہ پیچیدہ انسانی تجربات کی تفہیم کرتے ہوئے معاشرے کی عکاسی اور سماجی تبدیلی کی اصل شبیہ پیش کی ہے۔ ادب میں ہم جنس پرستی ایک ایسا موضوع ہے جسے ادیبوں اور دانشوروں نے کہیں نپے تلے تو کہیں واشگاف انداز میں پیش کیا ہے۔ ادب میں ہم جنس پرست کی ایک مکمل اصطلاح ہے جو مرد و زن کے ایک خاص ہم جنس پرست رویے کو پیش کرتی ہے۔ ایک ہی جنس کے افراد کے درمیان محبت کے موضوعات پوری دنیا میں مختلف قدیم تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ قدیم یونانیوں نے، خاص طور پر، افلاطون کے سمپوزیم ایسی تحریروں میں اس موضوع کو مختلف سطحوں پر تلاش کیا۔ بہت سے افسانوں اور مذہبی داستانوں میں مردوں کے درمیان رومانوی پیار یا جنسیت کی کہانیاں شامل ہیں یا اِن اعمال پر بحث ملتی ہے جن کے نتیجے میں جنس میں تبدیلی آتی ہے جو جنسیت اور جنس کے جدید تصورات کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

حالیہ دنوں میں، کوئیر تھیوری ماہرینِ تعلیم اور ادبی نقادوں کے درمیان بحث کا بڑا موضوع بن کر اُبھری ہے۔ کوئیر تھیوری (Queer Theory) ایک تنقیدی نظریہ ہے جو جنسیت، صنفی شناخت اور سماجی اصولوں کو چیلنج کرنے کے لیے پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظریہ 1990ء کی دہائی میں اُبھرا اور بنیادی طور پر ساختیات کے خلاف ایک تحریک کے طور پر جانا جاتا ہے، جو جنسیت اور صنف کو سماجی، ثقافتی اور سیاسی نظام کے تناظر میں دیکھتا ہے۔ بٹلر نے اپنی کتاب "Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity" میں کوئیر تھیوری کے بنیاد گزار تصورات پیش کیے، جس میں انہوں نے صنف کو سماجی تشکیل (social construct) قرار دیا اور اس پر زور دیا کہ صنف کی ادائیگی (gender performativity) ہی ہماری شناخت کو تشکیل دیتی ہے، نہ کہ کوئی حیاتیاتی حقیقت:

> "Gender is not something that one is, it is something one does, an act, or more precisely, a sequence of acts"[3]

لہٰذا اس نظریہ کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ ہم جنسیت اور ہم جنس پرستی دونوں سماجی طور پر تعمیر کی گئی ہیں اور یہ کہ کسی بھی جنسی شناخت کے بارے میں کچھ بھی "قدرتی" نہیں ہے۔ ادب میں ہم جنس پرستی اپنے موضوعات، تصورات اور نقطہ نظر کی بدولت ایک منفرد بحث

بن چکی ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ ہم جنس پرستی کے بارے میں اپنے رویوں میں ارتقائی مراحل طے کرتا جارہا ہے، اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ ادب ان تبدیلیوں کی عکاسی اور تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتا رہے گا۔

بات اردو ادب کی کریں تو اس میں بھی ہم جنس پرستی اپنی کئی اشکال میں سامنے آئی ہے۔ ایسی ہی ایک شکل ریختی ہے، جو کہ شہوانی، شہوت انگیز اردو شاعری کی ایک صنف ہے، 18ویں صدی میں جنوبی ہندوستان میں اُبھری اور عورت اور زنانہ تعلقات کی عکاسی کرتی ہے۔ ریختی کی اصطلاح شاعر سعادت یار خان رنگین (1755ء-1835ء) نے وضع کی تھی اور زیادہ تر ریختی شاعر مرد تھے۔ ماخذ میں مذکور خواتین ریختی شاعروں کا کام بدقسمتی سے سب غائب ہو گیا ہے۔ 19ویں صدی میں، ریختی شاعری عام طور پر اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں اصلاح اور پاک کرنے کے نام پہ ادبی نقادوں، ایڈیٹروں اور شاعروں نے ایک عہد کی ادبی سماجی پیشکش کو نقصان پہنچایا ہے جس کے نتیجے میں ریختی زیادہ تدریسی اور کم شہوانی، شہوت انگیز سامنے آئی۔

اسی طرح فکشن میں ہم جنس پرستی ایک بھرپور اور متنوع پیشکش لیے ہوئے ہے۔ کلاسیکل افسانوں سے لے کر جدید قیاس آرائی پر مبنی افسانے تک ان کو ثقافتی اور سماجی تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ قانون، مذہب اور سماجی اصول ایسے کئی ثقافتی و سماجی عوامل ہیں جو اردو ادب میں جنسیت کے موضوعات کی تصویر کشی کو متاثر کرتے ہیں۔ کچھ ممالک میں ہم جنس خواتین کو دنیا کے دیگر حصوں کی نسبت زیادہ قانونی تحفظات حاصل ہیں۔ مذاہب انسانی تعامل میں جنسیت کے کردار اور جنسی اخلاقیات کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں۔ زیادہ تر مذاہب جنسی سرگرمیوں کو منظم کرتے ہیں یا اخلاقی ضابطوں کے ذریعے بعض جنسی رویوں یا خیالات کو معیاری اقدار تفویض کرتے ہیں۔ اسی طرح جنس اور جنسیت کے بارے میں سماجی نظریات کی تشکیل میں سماجی اصول بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی اصول غیر تحریری اصول ہیں جو کسی خاص گروہ یا معاشرے کے اندر سماجی تعاملات اور رویے کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ اصول مختلف ثقافتوں کے درمیان وسیع پیمانے پر مختلف ہو سکتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر ہو سکتے ہیں۔ سماجی اصول اس بات پر اثر انداز ہوتے ہیں کہ افراد کس طرح اپنی جنسیت کو دیکھتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں، ساتھ ہی وہ دوسروں کے ساتھ کس طرح تعامل کرتے ہیں جو جنس اور جنسیت پر مختلف خیالات رکھتے ہیں۔

ادب سماج کا عکاس ہوتا ہے تو اردو ادب میں جنسیت کے موضوعات ثقافتی اور سماجی عوامل کے ساتھ قوانین، مذہب اور سماجی اصول سے متاثر ہوئے ہیں۔ یہ عوامل صنف اور جنسیت کے بارے میں سماجی نظریات کو تشکیل دیتے ہیں اور یہی مصنفین کی تخلیقات میں جھلکتا ہے۔ اردو ادب میں خواتین افسانہ نگاروں کے ہاں یہ رجحان بھرپور انداز میں سامنے آیا ہے۔ جیسا کہ اردو ادب کی ممتاز افسانہ نگار ممتاز شیریں نے اپنے ایک افسانے "انگڑائی" میں گلنار اور مس فنانس کے کردار کو پیش کیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار گلنار (لڑکی) اور اُس کی استاد مس فنانس ہیں۔ مس فنانس، گلنار کے حسن کی سب سے بڑی مداح ہوتی ہیں۔ کہانی میں اگرچہ افسانہ نگار نے دونو خیز خواتین کی جسمانی قربت کو کہانی کا مرکز نہیں بنایا لیکن مس فنانس کی محبت اتنی غالب آئی کہ گلنار اُسے محبت بھرے رومانوی خط لکھنے لگی:

> "اُن کے سامنے کہتی نہیں تھی تو کیا خطوں میں تو جو جی میں آیا، لکھ دیتی تھی۔ میرے دل کی ملکہ، میری جان، ملکہ حسن، میری آسمانی اینجلینا اور کیا کچھ نہیں لکھا کرتی تھی۔ عجیب رومان بھرے خط لکھا کرتی تھی، میں تو! اور وہ کبھی خفا نہ ہوتی تھیں"[4]

پھر یک لخت کہانی میں اُس وقت موڑ آتا ہے جب کالج کی طرف سے ایک ڈرامے میں گلنار جون کا کردار ادا کرتی ہے تو مس فنانس کے علاوہ باقی تمام اساتذہ اور دوست گلنار کی خوبصورتی اور اداکاری کی تعریف کرتے ہیں، یوں گلنار کے دل میں مس فنانس کے لیے نفرت پیدا ہو گئی۔

بعد ازاں گلنار اپنے منگیتر پرویز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔ افسانہ نگار نے یہاں ہم جنسی خواہشات کی تکمیل جنس پرستی تک منتج کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید خان لکھتے ہیں کہ:

"جنس نگاری کے سلسلے میں ان کی کہانی "انگڑائی" انفرادیت رکھتی ہے۔ یہ افسانہ ایک اہم نفسیاتی نکتہ کے گرد بُنا گیا ہے۔ بلوغیت کے ابتدائی دور میں انسان کو اپنی ہی جنس کی طرف کشش ہوتی ہے۔ پھر عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ مخالف جنس کی کشش غالب آجاتی ہے۔ کہانی میں میلانِ ہم جنسی کے عمل پر اتنا زور نہیں دیا گیا ہے جتنا کہ میلانِ ہم جنسی کے خلاف ردِ عمل پر اور میلانِ ہم جنسی کے جذبات اور کیفیات کے مقابلہ میں مخالف جنسی کشش کے غلبے کی نمائندگی کی گئی ہے"[5]

اردو کی بے باک افسانہ نگار عصمت چغتائی کا افسانہ "لحاف" بھی ہم جنس پرستی کی پیشکش کا عمدہ نمونہ ہے۔ کہانی کا آغاز واحد متکلم میں ہوتا ہے ایک جوان لڑکی جس کا نام بیگم جان ہے اس کی شادی ایک نواب صاحب سے ہو جاتی ہے۔ بیگم جان کا تعلق غریب خاندان سے ہے اور نواب صاحب ایک عمر رسیدہ انسان ہیں۔ نواب صاحب کو عورتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی حتیٰ کہ اپنی بیوی بیگم جان سے بھی جنسی طور پر دور ہی رہتے۔ ہر وقت اپنے آس پاس نوجوان طلباء کو ساتھ رکھتے، اُن کے تعلیمی اخراجات برداشت کرتے اور جنسی خواہشات کی اُمید میں رہتے۔ جس کی وجہ سے بیگم جان قید زدہ زندگی بسر کرتی ہے۔ بیگم جان کی ملازمہ ربو اس کی جسمانی مالش کرتی اور پاؤں دباتی رہتی ہے۔ ایک دن جب ربو ملازمہ بیگم جان کو چھوڑ کر چلی جاتی ہے تو کہانی کا واحد متکلم کردار (عصمت) کو اُس کی ماں آگرہ جاتے ہوئے بیگم جان کے پاس چھوڑ جاتی ہے۔ وہ بیگم جان کی جسمانی مالش کرتی، اس کی پیٹھ دباتی اور اس کے لحاف میں ساتھ سوتی۔ جب بیگم جان کو شدید خارش ہوتی تو وہ اسے کھجاتی اور بیگم جان لذت کشید کرتے ہوئے اس سے کہتی:

"ذرا زور سے کھجاؤ۔۔۔ بند کھول دو۔۔۔۔" بیگم جان بولیں

ادھر۔۔۔۔ اے ہے ذرا شانے سے نیچے۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ واہ بھئی واہ۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔ ہا" وہ سرور میں ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لے کر اطمینان کا اظہار کرنے لگیں"[6]

اس افسانے میں جنسی خواہشات کی تکمیل نہ ہونا بڑا موضوع ہے۔ جس کی وجہ سے ہم جنسیت سے جنسی خواہشات کی تکمیل کی جارہی ہے یعنی ایک عورت ہی دوسری عورت کو جنسی لذت سے سرشار کر رہی ہے۔ اگر تنقیدی نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کہانی میں مردانہ معاشرے میں مرد کو کمزور دکھایا گیا ہے۔ ڈاکٹر ظفر اللہ انصاری کے بقول:

"عصمت نے عورت کی جنسی ناآسودگی کے مسئلے کو اسی افسانے میں ایک دوسرے زاویے سے بھی پیش کیا ہے۔ بیگم جان صاحبہ اگرچہ ہم جنس پرستی کے عمل سے لطف اندوز ضرور ہوتی ہیں لیکن اس سے انہیں وہ آسودگی نصیب نہیں ہوتی جو ہر عورت حاصل کرنا چاہتی ہے، کیونکہ امرد پرستی کی طرح Lesbianism میں فاعل و مفعول نہیں ہوتے بلکہ فاعل ہی فاعل ہوتی ہیں"[7]

لحاف کا مرکزی موضوع جنسی ناآسودگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات اور رویے ہیں۔ بیگم جان کی زندگی اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ شادی شدہ زندگی کی جسمانی اور جذباتی پہلوؤں کی اہمیت کتنی زیادہ ہے اور ان کی غیر موجودگی کسی بھی شخص کو کس طرح متاثر کر سکتی ہے۔ لحاف میں عورت کی سماجی حیثیت اور گھریلو زندگی میں اس کی گھٹن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بیگم جان کی زندگی اس بات کی عکاسی کرتی ہے کہ مردانہ سماج میں عورت کے جذبات اور خواہشات کو کس طرح نظر انداز کیا جاتا ہے اور یہ کہ وہ اپنے لیے جگہ کیسے بناتی ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ظفر اللہ انصاری مزید لکھتے ہیں کہ:

"لحاف" عصمت چغتائی کا مشہور ترین ہی نہیں بلکہ ایک شاہکار افسانہ ہے جس میں Homosexuality اور Lesbianism جیسے ان چھوئے مگر سلگتے ہوئے موضوعات کو پیش نظر رکھ کر طبقہ نسواں کے جنسی حقوق کی پامالی کو تانیثی نقطہ نظر سے طشت از بام کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس افسانے کی ابتداء امرد پرستی کے موضوع سے ہوتی ہے"[8]

کہانی میں عصمت چغتائی نے سماج کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے جن پر بات کرنا اس وقت ایک بڑا ممنوع سمجھا جاتا تھا، جیسے ہم جنس پرستی، جنسی رویے اور ازدواجی تعلقات کی کمی۔ عصمت چغتائی نے ایک نہایت جراتمندانہ انداز میں سماج کے ان موضوعات پر روشنی ڈالی جنہیں عام طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا۔ ان کی حقیقت پسندی کہانی کو منفرد بناتی ہے۔ لحاف ایک علامت کے طور پر کہانی میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ نہ صرف بیگم جان کی اندرونی زندگی کو چھپانے کا کام کرتا ہے بلکہ قاری کو ان کے جذباتی اور جسمانی تجربات کی جھلک بھی دیتا ہے۔ لحاف کے نیچے ہونے والی حرکات بیگم جان کی زندگی کے ان پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں جو سماجی پابندیوں اور شرم کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔ "لحاف" کے بارے میں تصنیف حیدر لکھتے ہیں کہ:

"ہم مان سکتے ہیں کہ یہ کہانی عام ہندوستانی معاشرے کی حبس زدہ زندگی میں جنم لینے والی ہم جنسیت کی ایک مثال ہے مگر عصمت کے لکھے ہوئے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی کہیں نہ کہیں اس عمل کو پسند نہیں کرتیں۔ اُن کا سارا زور اس گھٹن پر ہے، عورت اور مرد کے اس تعلق پر ہے، جس کے کمزور پڑتے ہی ہم جنسیت کا بھوت معاشرے میں گشت لگانا شروع کر دے گا"[9]

"لحاف" عصمت چغتائی کی تخلیقی جرات، حقیقت پسندی اور سماجی شعور کی بہترین مثال ہے۔ یہ کہانی نہ صرف عورت کی جذباتی اور جسمانی زندگی کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے بلکہ اس وقت کے سماج کی دوغلی اخلاقیات پر بھی سوال اٹھاتی ہے۔

اسی طرح ہم جنس پرستی کے موضوع پر مبنی صدیقہ بیگم کے افسانے "تارے لرز رہے ہیں" کے مرکزی کردار دو بہنیں برجیس اور صفی ہیں۔ ان کی بھابھی کو پڑھائی کو بہت شوق ہے اس لیے کالج کی طالبہ صفی سے پڑھنا چاہتی ہیں۔ اس کہانی میں صدیقہ بیگم نے ہم جنس پرستی کے موضوع کو منفرد اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ یعنی صفی کی بھابھی کے پڑھنے کی خواہش کے پیچھے ہم جنسیت کی طلب ہے۔ جب بھابھی صفی کے ساتھ پڑھائی شروع کرتی تو اُسے اپنی بانہوں میں لے لیتی:

"بھابھی مسکرائیں اور پھر دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئیں۔ میری آنکھوں کے سامنے صفی آ گئی۔ بھابھی پوری طاقت سے اس کو بھینچ رہی تھیں۔ اس کا۔۔۔ سانس پھول رہا تھا۔۔۔ "اوئی اللہ! چھوڑو بھی کیا بری عادت ہے جو اس طرح بھینچتی ہو۔ ساری ہڈیاں ہل جاتی ہیں۔" میرے بھی جی میں آئی کہ اسی طرح چیخوں پھر جیسے کسی نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو اور میری آنکھیں ایک لذت آمیز کرب سے اچانک پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صفی بے وقوف ہے جو اس زور سے چیختی ہے۔ کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا۔ میں جھینپ سے گئی۔۔۔ بھابھی کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی"[10]

صفی بھابھی کے اس فعل پر احتراز برتتی لیکن جب یہی فعل وہ صفی کی بڑی بہن برجیس سے کرتی ہے تو اُسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مصنف نے ہم جنس پرستی کو موضوع بناتے ہوئے فرد کی جنسی تسکین کو اُس کے خارجی جذبات کا موجب ٹھہرایا ہے۔ اس کہانی میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ دو خواتین نہ چاہتے ہوئے بھی ہم جنس پرستی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ مقالہ نگار ارشاد انصاری صدیقہ بیگم کے جنسی افسانوں کا دفاع کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"ان کے یہاں لڑکیوں کے جذبات واحساسات اور ذہنی کرب بیان ہوتے ہیں لیکن اس میں جنس کا عمل دخل نہیں ملتا۔ کم سن لڑکیوں اور عورتوں کو موضوع بنا کر لکھے گئے افسانوں میں بھی جنس پرستی اور عریانیت کا کہیں ذکر نہیں ہوتا بلکہ ایک صحت مند عناصر کی تشکیل پر زور ملتا ہے۔ مثلاً افسانہ "تارے لرز رہے ہیں" میلان ہم جنسی کے موضوع پر لکھا ہوا ان کا بہترین افسانہ ہے لیکن اس افسانے میں صدیقہ کا نقطہ نظر جنسی تخریب کے بجائے معاشرے کے تعمیری پہلوؤں پر ہے"[11]

ہاجرہ مسرور اپنی نڈر افسانہ نگاری میں ایک حوالے کا نام ہے۔ ان کا افسانہ "سل اونٹ پہاڑ" ہم جنس پرستی کے موضوع پر مبنی ہے۔ اس افسانہ میں ایک دس سالہ لڑکی زرینہ کی کجروی کا فنکارانہ بیان ملتا ہے جو اپنی ماں کے مر جانے کے بعد اپنے باپ کی نازیبا حرکتوں سے خائف ہے اور محبت کی تلاش میں اپنی عمر سے بڑی لڑکی شاداں سے محبت کرنے لگتی ہے۔ زرینہ اپنی محبت کا خیال اس طرح رکھتی جیسے کوئی لڑکا اپنی محبوبہ کا خیال رکھتا ہے اور سب سے نظریں بچا کر شاداں کے ہونٹوں کو چومتی، بوسے لیتی اور اس پر اپنا حق جتاتی ہے۔ ہم جنسی جذبے کا اظہار وہ اپنی ہمسائی دوست شاداں سے دبے دبے لفظوں اور عجیب وغریب جسمانی حرکات سے کرتی ہے اور بعد ازاں شاداں اس جنسی انسیت کو نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لیتی ہے۔ شاداں کے بیمار ہونے پر زرینہ جب پیار پیار سے کنگھی کرتی ہے تو زرینہ کو نیند آنے لگ جاتی ہے اور پھر اچانک زرینہ محسوس کرتی ہے کہ:

"اُس کا ہاتھ کنگھی کرتے کرتے رُکا اور میرے چہرے پر پھرنے لگا اور پھر اچانک میں نے اُس کی تپتی ہوئی سانس اپنی چہرے پر اور جلتے ہوئے ہونٹ اپنے ہونٹوں پر محسوس کیے، میرے ٹھنڈے جسم کی رگوں میں چنگاریاں سی کلبلائیں اور میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

"تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو" اُس نے میرے چہرے کو اپنی سلگتی ہوئی ہتھیلیوں میں بھینچا اور میں بغیر سوچے سمجھے اپنے اوپر ناز کرنے لگی"[12]

ہاجرہ مسرور نے فنکارانہ انداز سے زرینہ کے جنسی جذبات کو بیان کیا ہے۔ عورت ذات میں دبی دبی خواہشیں کسی وقت بھی موقع پا کر اجاگر ہوتی ہیں۔ جب عورت کو مرد کا سہارا نہیں مل پاتا تو وہ پھر اپنے ہم جنس کی طرف مائل ہوتی نظر آتی ہیں۔ زرینہ کے اندر یہ ہم جنس جذبہ باپ کی نازیبا حرکات کا ردِ عمل دکھائی نہیں دیتا بلکہ خود بخود شاداں کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے۔ افسانے میں بیشتر مقامات پر زرینہ اور شاداں کی امنگوں اور خواہشات کی نفسیاتی عکاسی ملتی ہے۔ بعض مقامات پر یہ تاثر بھی ابھرتا ہے کہ ہم جنس میلان کس طرح عورت کی نفسیات میں شامل ہو کر ذہنی الجھن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ارشد انصاری اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں کہ:

"افسانے میں جنسی حقیقت نگاری اور عریانیت کے چند مناظر بھی قلم زد ہوئے ہیں لیکن ہاجرہ کا کمال یہ ہے کہ اُن کا نقطہ نظر عریانیت کے بجائے افسانوی کردار زرینہ اور راوی کے ذہنی نفسیات کو اجاگر کرنا رہا ہے"[13]

فرخندہ لودھی کا شمار نسائیت کی علمبردار افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنے قلم کے ذریعے عورت کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھا ہے۔ عورت ہونے کے ناطے وہ اپنی ہم جنس سے بہت ہمدردی رکھتی ہیں۔ اگرچہ مرد وزن ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں لیکن دونوں کی جسمانی وجذباتی ضرورتیں اور فطری وجبلی صلاحیتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے معاشرہ عورت کے حقوق وفرائض کے حوالے سے افراط وتفریط کا شکار ہے۔ عورت کو جسمانی، جذباتی اور جنسی ضروریات کے براہِ راست اظہار پر تنقید کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ داخلی محرومی اور نفسانی خواہشات کی عدم تسکین کے باعث بعض اوقات عورت کے جنسی میلانات غیر فطری راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے

ہیں۔ اس پس منظر میں لودھی کا لکھا ہوا ایک افسانہ "گولڈ فلیک" ہے جو ہم جنس پرستی کی عکاسی کرتا ہے۔ اس افسانے میں تنو اور مس کوکب ایک دوسرے سے جنسی تسکین حاصل کرتی ہیں، جس کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں:

"وہ پیاسے تھے پھر اُس کی انگلیوں نے بڑی عورت کے ہونٹوں کو چھوا اور اپنا رخسار اُس کے کندھے پر رگڑنے لگی۔

"مس کوکب!۔۔۔۔"

مس کوکب نے جھک کر اُس کے رخساروں کو چوما۔ پھر اُس کے ہونٹ سرکنے لگے، دوسری کے ہونٹوں پر آکر وہ یوں رک گئے جیسے غنودگی کے عالم میں چلتے چلتے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہو۔

"تنو!۔۔۔"مس کوکب کی آواز نشیلی اور بھاری تھی۔ اُس نے تنو کو جھٹک کر اس طرح الگ کیا کہ وہ تڑپ کر رہ گئی"[14]

علاوہ ازیں اسی افسانہ میں ہم جنسیت کو علامتی انداز دے کر ایک نئے انداز سے دکھانے کی سعی بھی ملتی ہے۔ جس میں مس کوکب سابقہ شوہر کی عدم موجودگی میں گولڈ فلیک کے دھوئیں سے تسکین اور لذت حاصل کرتی ہے جیسے خود اس کا شوہر اس کے آس پاس موجود ہو۔ افسانے کی فضا جنسی استعاروں اور علامتی زبان سے بھری ہوئی ہے، جو کہانی کے موضوع کو نفسیاتی اور سماجی حوالوں سے گہرا بناتی ہے۔ مس کوکب اور تنو کے رشتے کی پیچیدگی اس وقت مزید نمایاں ہو جاتی ہے جب یہ تعلق جسمانی قربت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اس تعلق کے ذریعے مصنفہ نے خواتین کی نفسیاتی ضروریات اور معاشرتی توقعات کے درمیان تضاد کو بڑی باریکی سے اجاگر کیا ہے۔ افسانے میں "گولڈ فلیک" کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جو تنہائی اور جذباتی محرومی کو ظاہر کرتا ہے۔ مس کوکب کے کردار میں موجود بے باکی اور تسکین کے لیے غیر روایتی طریقوں کی تلاش معاشرتی پابندیوں کے خلاف ایک احتجاج کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔

صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مرد فکشن نگاروں کے ہاں بھی ہم جنس پرستی ایسے موضوع کی پیشکش ہوئی ہے۔ عہدِ حاضر کے معروف افسانہ نگار اور ناول نگار مشرف عالم ذوقی نے اپنے افسانے "کاتیائن بہنیں" میں بڑی بہن رما کاتیائن اور چھوٹی بہن رتیا کاتیائن کے ذریعے اس موضوع کو بیان کیا ہے۔ شرابی باپ جو ان کی ماں کو پیٹتا تھا اور بعد میں سانڈ کی ٹکر سے باپ کے مرنے اور ماں کے نیم پاگل ہو جانے کے بعد دونوں بہنیں ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ بچپن کے دن یاد کرتے ہوئے رما کاتیائن اپنی چھوٹی بہن کو کہتی ہے کہ:

"تمہیں یاد ہے؟۔۔۔ جب یکایک ڈر کر سہم کر تم مجھ سے چپک جایا کرتی تھی تو۔۔۔ یا میری گود میں اپنا سر رکھ دیتی تھی تو۔۔۔ یہاں ٹانگوں کے درمیان سے۔۔۔ کسی ایک مرکز سے دریا پھوٹ پڑے تو۔۔۔ کیسا لگتا ہوگا؟ اندر سنسناہٹ کا ایک طوفان سا آجاتا تھا"[15]

یہ افسانہ معاشرتی جبر، خاندان کے انتشار اور خواتین کے داخلی جذباتی تضادات کو اجاگر کرتا ہے۔ والد کی شراب نوشی اور ماں کی نیم پاگل حالت نے دونوں بہنوں کو ایک دوسرے کا سہارا بننے پر مجبور کیا۔ اس تنہائی اور جذباتی خلا نے انہیں ایک دوسرے کی محبت اور جسمانی قربت کی طرف مائل کر دیا۔ کہانی میں بہنوں کے مابین محبت اور قربت کے رشتے کو سماجی جبر کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے، جہاں ان کے تعلق کو معاشرتی اقدار کے مطابق قبول نہیں کیا جا سکتا۔ معاشرے کی دھتکار اور ماں باپ کے جانے کے بعد دونوں بہنیں کچھ اس طرح ایک دوسرے کے قریب آئیں کہ دونوں نے خود کو ایک دوسرے میں سمو لیا اور شرم کے تمام پردے اتار کر رکھ دیئے:

"اور اب میں یہ دکھانا چاہتی ہوں کہ اس مکمل سماج کے پاس کیسی کیسی فینتاسی موجود ہے۔۔۔ ٹھہرو، ہاں۔ ہو سکے تو وارڈ روب سے اپنی کھلی کھلی نائٹی نکال لو۔ سلیولیس (Sleeveless) ۔ تم اس عمر میں بھی آہ۔ اس عمر میں بھی۔۔۔"بڑی

کاتیائن کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ”سنا تم نے۔ “اسے بتا دینا، عورت اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے۔۔۔ اسے مرد کی ضرورت نہیں“ پھر وہ اس پر جھک گئی۔ رات خاموشی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔[16]

افسانے ”کاتیائن بہنیں“ میں ہم جنسیت کو ایک منفرد انداز میں پیش کیا گیا ہے، جہاں کہانی کا محور دو بہنیں، رما کاتیائن اور رتیا کاتیائن ہیں۔ کہانی میں دونوں بہنوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے، خاص طور پر ان کے بچپن سے جوانی تک کے تجربات کو۔ معاشرے میں اس کی بڑھتی ہوئی روش کو اب عام انداز میں پیش کیا گیا ہے جیسا کہ اس افسانے کے آخر میں چھوٹی بہن بھوپیندر کو بغیر کسی ڈر اور خوف کے بتا دیتی ہے کہ:

"ہاں، ہم لسبین (Lesbian) ہیں۔۔۔ لسبین۔ "وہ بڑے اطمینان سے ناخن چباتے ہوئے بولی"[17]

افسانے کے آخر میں رتیا کاتیائن کا اپنے رشتے کا اعتراف اور "لسبین" کے طور پر اپنی شناخت ظاہر کرنا، کہانی کے سماجی تناظر کو بدلنے کی ایک کوشش ہے۔ یہ افسانہ نہ صرف ہم جنسیت کے موضوع کو بیان کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے انسانی نفسیات، سماجی رویوں اور جنسی شناخت کی اہمیت کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اس افسانے میں جرأت مندی سے ایسے موضوع کو بیان کیا ہے جو عموماً ممنوع سمجھا جاتا ہے اور یہ اس موضوع پر اردو ادب کی ایک اہم تخلیق ہے۔ رما کاتیائن اور رتیا کاتیائن کے درمیان موجود جذبات اور تعلقات نہ صرف جسمانی ہیں بلکہ ان کی گہری جذباتی وابستگی ایک دوسرے کے لیے تحفظ کے احساس کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ افسانہ معاشرتی اصولوں اور انفرادی آزادی کے درمیان تصادم کی عکاسی کرتا ہے، جہاں دونوں بہنوں کا رشتہ سماجی روایات کے لیے ایک چیلنج بن جاتا ہے۔

صدیق عالم اردو ادب کے ایک معروف افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ”ٹی پاٹ“ میں کہانی کا آغاز واحد متکلم کردار کے ذریعے ہوتا ہے جو کہانی کو آگے بڑھاتا ہے جبکہ دوسرا مرکزی کردار ڈاکٹر پنچم سینا پتی ہے جو بنگلہ دیش سے مراجعت کر کے آتا ہے اور ہسپتال میں بطور ڈاکٹر فرائض سرانجام دیتا ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے ہم جنسی پرستی کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ہونے کے ناطے پنچم سینا اپنے مریض کے ساتھ بطور ہم جنس پرست دلچسپی لیتا ہے۔ یہاں مصنف نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ فرد کے داخلی جذبات معاشرتی قدغنوں سے آزاد ہوتے ہی خارجی عوامل تک رسائی پانے میں شدید دلچسپی و لگاؤ رکھتے ہیں۔ ہسپتال میں آئے ہوئے ایک مریض سے ڈاکٹر پنچم سینا پتی اُس کا معالج نہ ہونے کے باوجود جنسی دلچسپی لیتا ہے:

”اس سلسلے میں یہ افواہ بھی اڑی ہوئی ہے کہ وہ ہم جنسیت کا شکار ہے اور اس نے ایک سوئیپر کو جسمانی تعلقات قائم کرنے کی پیش کش بھی کی ہے۔ وہ پنچم کا مریض نہیں، مگر پنچم اس میں دلچسپی لینے لگا ہے۔ وہ اکثر اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے کیبن میں آدھمکتا ہے“[18]

کہانی میں ہم جنس پرستی کے ضمن میں فرد کی حالت زار کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر پنچم یہ بھی کہتا ہے کہ میں جہاں جاتا ہوں یہ شہر میں میرے پیچھے آتے ہوئے مجھے دکھائی دیتا ہے۔ افسانہ نویس نے مدھم علامتی اظہار کے ذریعے ہم جنس پرستی سے جڑی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کیا ہے۔

اسی طرح ممتاز افسانہ نگار محمد علی کے افسانے ”تیسری جنس“ کی مرکزی کردار بیوہ مدی اور اُس کے گھر کام کی غرض سے رہنے والی مردانہ شباہت عورت ہے جنہیں محلے کی عورتیں شک کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ قریباً دو سال مدی اور اُس عورت کی دوستی قائم رہی پھر ایک دن کسی بات پر اُن کا جھگڑا ہو گیا اور بی مدی اکیلے ہی رہنے لگی۔ اگرچہ تھوڑے دنوں بعد ایک اور ہم جنس مل گئی لیکن وہ پہلے جیسی بات نہ رہی:

"ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ہر عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنے ہی جنس سے تعلقات اچھے معلوم ہوتے ہوں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں"[19]

کہانی میں بی مدی کی شخصیت اور اس کے ساتھ رہنے والی عورت کے کردار کے ذریعے معاشرتی رکاوٹوں، محرومیوں اور جذباتی خلا کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ تعلق معاشرتی اور ثقافتی دباؤ کے تحت پروان چڑھتا ہے، جس میں جذباتی سکون اور تسکین کا پہلو غالب آتا ہے۔ کہانی نہ صرف ان غیر روایتی تعلقات کی حقیقت کو سامنے لاتی ہے بلکہ ان سے جڑی نفسیاتی اور سماجی پیچیدگیوں کو بھی روشنی میں لاتی ہے۔ بی مدی اور اس کی ساتھی کے درمیان تعلق کی نوعیت، ان کے رویوں اور ان پر معاشرتی ردعمل کے ذریعے کہانی یہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ تعلق محض جسمانی یا جنسی پہلو تک محدود نہیں بلکہ جذباتی اور نفسیاتی عوامل کا نتیجہ ہے۔ کہانی کے متن میں یہ واضح ہے کہ یہ تعلقات نہ صرف داخلی جذبات کا اظہار ہیں بلکہ خارجی ماحول کے جبر کا ردعمل بھی ہیں۔ "تیسری جنس" کے حوالے سے تصنیف حیدر لکھتے ہیں کہ:

"اردو میں مجھے ایک ہی کہانی ایسی ملی ہے جس میں ہم جنسیت کی صحیح تصویر کی گئی ہے اور وہ ہے چودھری محمد علی ردولوی کی "تیسری جنس" عصمت کے برخلاف اس کہانی کو اس طرح نہیں لکھا گیا کہ اس میں ہم جنسیت کو کوئی برا یا غیر اخلاقی فعل سمجھا جائے بلکہ اسے پڑھنے والے کی بصیرت پر چھوڑ دیا گیا ہے"[20]

مصنف نے اس موضوع کو انتہائی غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ کہانی میں نہ تو ہم جنسیت کی حمایت کی گئی ہے اور نہ ہی اسے غیر اخلاقی قرار دیا گیا ہے بلکہ قاری کو اپنے نظریات کے مطابق کہانی کے کرداروں اور ان کے تعلقات کو سمجھنے کا موقع دیا گیا ہے۔ "تیسری جنس" کی اہمیت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ یہ کہانی ہم جنس پرستی کو صرف ایک جسمانی تعلق کے طور پر نہیں بلکہ ایک سماجی، نفسیاتی اور جذباتی مسئلے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ انسانی جذبات، خواہشات اور تعلقات کو کسی ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ یہ کہانی اردو فکشن میں جنسیت کے موضوع پر ایک اہم اضافہ ہے، جو سماجی تنقید اور انسانی نفسیات کی گہری بصیرت فراہم کرتی ہے۔

حسن عسکری کا افسانہ "پھسلن" بھی اس موضوع کی عمدہ مثال ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جمیل جو پندرہ سولہ برس کا سجیلا جوان ہے جس کا نوکر عمر رسیدہ سید نذیر علی عرف نذرو ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے ہم جنس پرستی کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ اگرچہ جنس بہت سے ادیبوں کی کہانیوں کا موضوع رہا ہے لیکن ہم جنس پرستی بھی کہانی اور فکشن کا بڑا موضوع بن کر اُبھرا ہے۔ بنیادی طور پر ہر معاشرہ اس عفریت میں مبتلا رہا ہے۔ پھسلن ایک نوجوان کی کہانی ہے جس میں وہ اپنے نوکر سے ہم جنس پرستی کا شکار ہوتا ہے اور نہ چاہنے کے باوجود بھی انکار نہیں کر پاتا۔ جب نذرو جمیل کو اپنے خواب کے متعلق بتانا چاہتا ہے تو وہ اسے حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ اس پر جمیل تفصیل پوچھنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو نذرو کہتا ہے:

"ہاں تو میں نے یہ دیکھا خواب میں، جمیل! کہ۔۔۔۔ کہ۔۔۔ میں اور تم ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں"[21]

حسن عسکری نے ہم جنس پرستی ایسے موضوع کو انسانی فطرت یا خواہش کے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک جنس پرستی کی طرح بعض انسانوں میں ہم جنس پرستی بھی انسانی خواہشات کا تقاضا ہے۔ افسانہ نگار نے کہانی میں انسانی خارجی عوامل کی بنا پر ہم جنسیت کے موضوع کو چھیڑا جس میں اپنی منشا سے ایک نوجوان، عمر رسیدہ آدمی (نذرو) سے جنسی اختلاط کا مرتکب ٹھہرتا ہے:

"نذرو کا ہاتھ اس کی ٹانگ کے قریب آ گیا، "نا ویسے ہی"

"ہونھ!" جمیل نے جھینپتے ہوئے کہا۔ لیکن جب نذرو کا ہاتھ اس کی ران پر پہنچ گیا تو اس نے کوئی اعتراض کیا بھی نہیں اور چپ لیٹا رہا"[22]

حسن عسکری نے افسانے میں جنسی خواہشات کو انسانی فطرت کے ایک پہلو کے طور پر پیش کیا ہے۔ نذرو کا کردار انفرادی خواہشات اور ان کے نفسیاتی پہلوؤں کا عکاس ہے، جو اس کے رویے کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ جمیل کی خاموشی اور انکار نہ کرنا، معاشرتی رویوں، عمر کے فرق اور طاقت کے عدم توازن کے درمیان ایک گہری جھلک پیش کرتا ہے۔ افسانے کے مناظر میں حسن عسکری نے نذرو اور جمیل کے درمیان جنسی تعلق کی ابتداء کو غیر واضح لیکن مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ نذرو کا جمیل کے قریب آنا اور جمیل کا اس پیش رفت پر رد عمل نہ دینا، کہانی میں جنسی کشش اور عدم اعتراض کے درمیان موجود باریک فرق کو نمایاں کرتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ہم جنسیت کے اظہار کو معاشرتی الجھنوں کا پلندہ نہیں بتایا بلکہ فرد کی ذاتی تسکین کا باعث ٹھہرایا ہے۔ اس افسانے کے بارے میں ڈاکٹر عبدالرشید خاں لکھتے ہیں کہ:

"پھلسن نذرو اور جمیل دو کرداروں کا تجزیہ ہے اور بالخصوص جمیل کا جس کے ناپختہ احساس میں خارجی عناصر کے غیر متوقع طرزِ عمل سے کھرچن سی ہونے لگتی ہے اور دل علی بابا کے غار میں داخل ہونے کو چاہتا ہے۔ یہ افسانہ جنسی خواہش اور اعصابی ہیجان کا رموزی طریقہ سے بے حد فنکارانہ تجزیہ ہے"[23]

جنس کے موضوع پر سعادت حسن منٹو نے بہت لکھا ہے اور باکمال لکھا ہے۔ ان کے جنس کے موضوع پر لکھے گئے دیگر افسانوں کی طرح "اصلی جن" بھی ہم جنس پرستی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار فرخندہ ہے جس کا باپ نواب نوازش علی وفات پا جاتا ہے تو وہ تنہائی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے اور ساتھ میں ایک ہمسائی لڑکی نسیمہ سے دوستی کر لیتی ہے۔ منٹو نے اس کہانی میں انسانی نفسیات کے پردے میں چھپی نفسی الجھنوں کو بیان کیا ہے اور بالخصوص خواتین کے مسائل کو اس کہانی میں دیکھا جا سکتا ہے کہ نسیمہ جب فرخندہ کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی ہے تو وہ اس سے نفسی حظ کشید کرتی ہے۔ نسیمہ جو مردانہ خصلتوں کی حامل خاتون ہے، فرخندہ کو نہایت بھلی لگتی ہے اور فرخندہ اس سے عمر بھر تعلق نبھانے کا عہد بھی کرتی ہے۔ نسیمہ فرخندہ کو ناول واپس کرتے ہوئے اس میں ایک خط رکھتی ہے جس میں وہ فرخندہ کو ملاقات کا طریقہ بتاتی ہے۔ اگلے ہی دن عین اسی طریقے کے مطابق فرخندہ نسیمہ کو ملاقات کے لیے بلاتی ہے تو وہ کچھ اس انداز سے فرخندہ سے ملتی ہے:

"نسیمہ آتے ہی چار ساڑھے چار فٹ کی منڈیر پر مردانہ انداز میں چڑھی اور دوسری طرف کود کر فرخندہ سے لپٹ گئی اور جھٹ سے اس کے ہونٹوں کا طویل بوسہ لے لیا۔ فرخندہ بہت خوش ہوئی۔ دیر تک دونوں گھل مل کر باتیں کرتی رہیں۔ نسیمہ اب اُسے اور زیادہ خوبصورت دکھائی دی"[24]

چونکہ فرخندہ اور نسیمہ کا جنسی لگاؤ ہوتا ہے اس لیے کئی دن نسیمہ کا فرخندہ سے ملنے نہ آنا فرخندہ کو ذہنی مریض بنا دیتا ہے۔ فرخندہ کو جب گھر میں قید کر لیا جاتا ہے تو وہ تنہائی سے تنگ آ کر نسیمہ سے ملنے چلی جاتی ہے اور اسے وہاں نہ پا کر اس کے بھائی سے جنسی ملاپ اختیار کرنے سے نہیں کتراتی۔ سعادت حسن منٹو نے بے جا گھریلو پابندیوں کی مخالفت کی ہے جو فرد کی نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو کا ایک اور افسانہ "دھواں" جنس پرستی کی عمدہ مثال ہے جس کا مرکزی کردار مسعود اور اس کی بہن کلثوم ہے۔ مسعود اپنی بہن کلثوم اور اس کی دوست بملا کو کمرے میں ایک ساتھ دیکھتا ہے:

"مسعود نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔ دو چیخیں بلند ہوئیں اور کلثوم اور اس کی سہیلی بملا نے، جو کہ پاس لیٹی تھی، خوفزدہ ہو کر جھٹ سے لحاف اوڑھ لیا۔ بملا کے بلاؤز کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور کلثوم اس کے عریاں سینے کو گھور رہی تھی"[25]

اس موضوع پر اردو فکشن میں ناول سے حوالے ڈھونڈیں تو "ٹیڑھی لکیر" عصمت چغتائی کا شاہکار ناول ہے۔400 صفحات پر مشتمل اور سوانحی انداز میں لکھے ہوئے اس ناول میں عصمت چغتائی نے شمن نام کی ایک کردار کے ارد گرد ہی پورے ناول کا خاکہ کھینچا ہے جو اپنے والدین کی دسویں اولاد ہونے کے سبب ان کی محبتوں اور شفقتوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ چونکہ عصمت چغتائی فرائڈ کے نظریات سے متاثر تھیں۔ جس کے تحت کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس ناول میں عصمت نے جنسی پہلو کو ایک خاص انداز میں پیش کیا ہے جس میں کھلی حقیقت نگاری ہے۔ اس ناول میں ہم جنسیت کا پہلو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ شمن کا گھرانہ مشرقی تہذیب کا پروردہ تھا لہٰذا اسکول کے ماحول میں اسے نئی زندگی ملی جہاں رہنے والی کچھ لڑکیاں ہم جنس پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں جن میں ایک استانی مس چرن بھی شامل تھیں جسے بعد ازاں سکول سے نکال دیا جاتا ہے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی شمن بھی اس ملعون فعل میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالرشید خان اس ناول کی بابت لکھتے ہیں کہ:

> "عصمت چغتائی کا ناول "ٹیڑھی لکیر" اس سلسلے میں ایک بہترین ناول ہے۔ ناول عورتوں میں پائی جانے والی ہم جنسیت کے رجحان کا کھلم کھلا اظہار ہے۔ ناول کی ہیروئین شمن ابتدائے زندگی سے ہی جنسی کجرویوں میں اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول کی پروردہ ہے جہاں جنسی پیچیدگیاں اور جنسی الجھنیں پہلے سے ہی موجود ہیں اور جہاں استانیوں اور طالبات کے درمیان ہم جنسیت کا چسکا بشدت پایا جاتا ہے"[26]

مذکورہ بالا مباحث سے اردو ادب میں ہم جنس پرستی کے موضوع کی پیشکش کے چند نمایاں پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اردو ادب میں ہم جنس پرستی کو دبی ہوئی خواہشات، جذباتی خلا اور نفسیاتی الجھنوں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ یہ پہلو خاص طور پر خواتین کے کرداروں میں نمایاں ہے، جہاں وہ جذباتی اور جسمانی آزادی کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ خاندانی انتشار اور سماجی قدغنیں ہم جنس پرستی کے رجحانات کو پروان چڑھانے میں اہم عوامل ہیں۔ یہ عوامل ان کہانیوں میں بار بار سامنے آتے ہیں جہاں روایتی تعلقات کی کمی یا ناکامی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

ہم جنسیت کے موضوع کو اردو افسانے اور ناول میں علامتی، استعاراتی اور نفسیاتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ موضوع صرف جنسیت کی نمائندگی نہیں بلکہ انسانی جذبات، سماجی مسائل اور آزادی کی تلاش کا بھی مظہر ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں نے ہم جنسیت کو نسائی مسائل اور سماجی جبر کے خلاف علامتی اظہار کے طور پر پیش کیا، جو نسائی تحریک کا حصہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں ہم جنسیت کو ایک ممنوعہ اور متنازعہ موضوع کے طور پر دیکھا جاتا رہا ہے، جس پر لکھنے والے ادیبوں کو سماجی تنقید اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

لہٰذا ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہم جنس پرستی کا موضوع اردو ادب میں محض ایک جنسی میلان کے طور پر نہیں بلکہ ایک سماجی، نفسیاتی اور ادبی حقیقت کے طور پر سامنے آیا ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والے ادیبوں نے انسان کی داخلی اور خارجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو عمدگی سے پیش کیا ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ادب صرف تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی حقیقتوں کو بیان کرنے کا ایک طاقتور وسیلہ بھی ہے۔ اردو ادب محض تفریح یا تعلیم کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی کی ان حقائق کو سمجھنے اور پیش کرنے کا طاقتور وسیلہ ہے جن پر عام طور پر بات نہیں کی جاتی۔ ہم جنسیت کا موضوع اردو فکشن میں جنسیت، سماج اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ تحقیق ہمیں نہ صرف ادب کے دائرے میں ہم جنسیت کے موضوعات کی وسعت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ یہ بھی دکھاتی ہے کہ اردو فکشن کس طرح انسانی تجربات اور سماجی مسائل کو تخلیقی انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

[1] https://en.wikipedia.org/wiki/Homosexuality Dated: 5.10.2024 ،7:35 pm

[2] خالد سہیل، **"ہم جنسیت کا تاریخی مطالعہ"**، مشمولہ، اثبات، کتابی سلسلہ 31، مدیر: اشعر نجمی، اپریل 2021ء، ص 11-

[3] Butler, Judith. Gender Trouble: Feminism and the Subversion of Identity. New York: Routledge, 1990, P. 25.

[4] ممتاز شیریں، **اپنی نگریا**، (لاہور: مکتبہ جدید 1948ء)، ص 68-

[5] ڈاکٹر عبدالرشید خان، **اردو افسانے میں جنس نگاری**، (دہلی: ذکریٰ انٹرنیشنل پبلشرز)، ص 119-

[6] عصمت چغتائی، **لحاف**، (لاہور: روہتاس بکس، 1992ء)، ص 24-

[7] ڈاکٹر ظفر اللہ انصاری، **تنقیدی معروضات**، (پٹنہ: علمی مجلس بہار، 2019ء)، ص 351-

[8] ایضاً، ص 350-

[9] تصنیف حیدر، **"ہم جنسیت کا سوال اور عام تعصبات کی نفسیات"**، مشمولہ، اثبات، کتابی سلسلہ 31، مدیر: اشعر نجمی، اپریل 2021ء، ص 95-

[10] صدیقہ بیگم، **دودھ اور خون**، (علی گڑھ: اردو گھر، 1957ء)، ص 88-

[11] ارشاد انصاری، **ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ**، مقالہ پی ایچ ڈی، (انڈیا: دی یونیورسٹی آف بردوان، مغربی بنگال، 2019ء)، ص 95-

[12] ہاجرہ مسرور، **سب افسانے میرے**، (لاہور: مقبول اکیڈمی، 1991ء)، ص 679-

[13] ارشاد انصاری، **ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ**، مقالہ پی ایچ ڈی، (انڈیا: دی یونیورسٹی آف بردوان، مغربی بنگال، 2019ء)، ص 170-

[14] فرخندہ لودھی، **شہر کے لوگ**، (لاہور: یونیورسل بکس)، ص 28-

[15] مشرف عالم ذوقی، **نفرت کے دنوں میں**، (دہلی: ایجوکیشنل ہاؤس، 2013ء)، ص 163-

[16] ایضاً، ص 165-

[17] ایضاً، ص 168-

[18] صدیق عالم، **لیمپ جلانے والے**، (نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس)، ص 147-

[19] محمد علی ردولوی، **کشکول محمد علی شاہ فقیر**، (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، 1980ء)، ص 483-

[20] تصنیف حیدر، **"ہم جنسیت کا سوال اور عام تعصبات کی نفسیات"**، مشمولہ، اثبات، کتابی سلسلہ 31، مدیر: اشعر نجمی، اپریل 2021ء، ص 94-

[21] حسن عسکری، **عسکری نامہ**، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1998ء)، ص 34-

[22] ایضاً، ص 37-

[23] ڈاکٹر عبدالرشید خان، **اردو افسانے میں جنس نگاری**، ص 116-

[24] بلراج مینرا، **منٹو کے گم شدہ اور غیر مطبوعہ افسانے**، (دہلی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، جون 1992ء)، ص 48-

[25] ڈاکٹر خالد اشرف، **فسانے منٹو کے**، (دہلی: کاک آفسیٹ پرنٹرز، 2007ء)، ص 193-

[26] ڈاکٹر عبدالرشید خان، **اردو افسانے میں جنس نگاری**، ص 44-